پیش لفظ

صدیوں سے روایتی مسلم ذہن جدالِ فقہی کی آماجگاہ ہے۔ امتِ مسلمہ کے درونِ خانہ مکالمے اس احساس سے خالی ہیں کہ وہ شہداء علی الناس کے فریضہ پر مامور انسانی تاریخ کے آخری رسولؐ کی امت ہے۔ اس نظری دعوے کے باوجود کہ ہم خیر امت ہیں واقعہ یہ ہے کہ اقوامِ عالم کی سیادت تو کجا بین الاقوامی سطح پر ہماری بے وزنی کے چرچے عام ہیں۔ جہاں دوسری قومیں مستقبل کے سلسلے میں مختلف منصوبے بنارہی ہیں ہمارا حال یہ ہے کہ ہم اپنے تابناک ماضی کے ورد سے صبح وشام کرتے ہیں جس سے کسی حد تک ہماری شکست وریخت کا نفسیاتی مداوا تو ہو جاتا ہے البتہ کسی نئی صبح کا کوئی امکان پیدا نہیں ہوتا۔ جدید دنیا میں سفر وحضر کی سہولتوں سے لے کر سرکائنات کی نقاب کشائی تک جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس میں ہمارا حصّہ بہت تھوڑا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ایجادات واختراعات کی اس جگمگاتی دنیا کی جڑیں جس ماضی بعید میں پائی جاتی ہیں اس کی قیادت کبھی ہمارے ہاتھوں میں رہی ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ محض ماضی کے اس رومانی تذکرے سے مستقبل کی کمان ہمارے ہاتھوں میں نہیں آسکتی۔

حیرت ہوتی ہے کہ جو لوگ اقوامِ عالم کے لئے منارۂ نور تھے وہ رفتہ رفتہ مسلم قومی خول میں کیسے محصور ہوتے گئے، یہاں تک کہ ان کے درونِ خانہ مکالمے سے کافۃ للناس کا تناظر جاتا رہا، بشیر ونذیر کا وصف ان کی شخصیت کا حصہ نہ رہا۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ دنیا کے چھ بلین انسانوں پر سرمایہ داری کا خونخوار عفریت مسلط ہے۔ پوری دنیا ٹیکس کی جبری مشین میں گس دی گئی ہے اور یہ شکنجہ روز بروز سخت تر ہوتا جارہا ہے۔ انسانوں کے لئے اس نظام سے باہر زندگی جینے کے امکانات تقریباً ختم ہو کر رہ گئے ہیں۔ جمہوریت سرمایہ دار مجرموں کی پناہ گاہ بن گئی ہے۔ ذرائع ابلاغ کے مسلسل استحصال نے انسانوں سے آزادانہ غور وفکر کی صلاحیت سلب کر لی ہے گویا ہم ایک ایسی دنیا میں جینے پر مجبور ہیں جہاں نہ زندگی جاتی ہے اور نہ موت آتی ہے: ﴿لا یموت فیها ولا یحی﴾۔

دینی علوم کی دانش گاہیں ایک ایسے نصاب کو جزوِ دین قرار دیئے بیٹھی ہیں جن پر صدیوں کی گرد جم چکی ہے۔ لین دین اور معاملات کے وہ تمام مسائل جو ان کتابوں میں بیان ہوئے ہیں یا فلکیات کا وہ علم جن کا ورداب بھی وہاں جاری ہے ایک ایسی دنیا

کی خبر دیتے ہیں جو عرصہ ہوا ہمارے ارد گرد سے غائب ہو چکی ہے۔ حرام وحلال کے وہ تمام فروعات، نکاح وطلاق کی موشگافیاں اور تقسیم وراثت کی باریک بینیاں اب نئی بدلی ہوئی صورت حال میں، قدیم تدوینی طرزِ فکر کے ساتھ، عدل وقسط کی ضمانت نہیں دے سکتے۔ ایسا اس لئے کہ خالص سرمایہ (Pure Capital) جس طرح سے اقوام عالم کی گردنوں پر شکنجہ کستا جا رہا ہے اب اس کا سدّ باب زکوٰۃ کی روایتی تطبیق یا چیریٹی ٹیکس کے ذریعے نہیں ہو سکتا بالخصوص ایک ایسی صورتِ حال میں جہاں سرمایہ داروں کے خیراتی ادارے بھی سرمایہ داری کے نظری جواز اور اس کی آبیاری کا کام انجام دے رہے ہوں۔ نبی کریم کا یہ فریضۂ منصبی ﴿ ویضع عنهم اصرهم والاغلال التی کانت علیهم ﴾ ان کے متبعین سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ انسانوں کی گردنوں کو ان تمام بوجھ سے نجات دلانے کے لئے سامنے آئیں جسے عہد حاضر کے استحصالی نظام نے فرد پر ڈال رکھا ہے کہ اس کے بغیر ﴿ کلمة الله هی العلیا ﴾ کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ گویا درونِ خانہ مسلم مکالمے کی از سرِ نو ترتیب وتدوین کے بغیر اقوام عالم کی سیادت کا خیال محض ایک نظری اور نفسیاتی خوش فہمی کو ہوا دینا ہوگا۔

اس مسئلہ پر ایک اور پہلو پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ مغرب کی وہ دانش گاہیں جنھیں آج ہم آکسفورڈ، کیمبرج اور سوبون کے نام سے جانتے ہیں، اپنی ابتدا میں شرعی علوم کی دانش گاہیں تھیں جن کا ابتدائی فریضہ عیسائی فکر کی تدوین وترتیب اور مناظرہ ومجادلہ کے لئے افرادِ کار کا پیدا کرنا تھا۔ البتہ عیسائی مولویوں کی ان دانش گاہوں کو آج فکری اور علمی سیادت میں کلیدی مقام حاصل ہے۔ اس کے برعکس ازہر، زیتونیہ، دیوبند اور اس قبیل کی دوسری مسلم دانش گاہیں جو شرعی علوم کے حوالے سے قائم ہوئی تھیں وہ کسی ایسے ارتقائی عمل سے یکسر خالی رہیں۔ ہمارے خیال میں اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ مسلم ذہن صدیوں سے آیاتِ احکام کو دین کا ما حصل سمجھ بیٹھا ہے۔ دین کا مکمل تصور اور آیاتِ اکتشاف کی دعوتِ تدبر وتفکر ان کی نگاہوں سے اوجھل رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم ذہن اب بھی عہدِ وسطیٰ میں جیتا ہے جہاں بقول اس کے قدماء غور وفکر کا سارا کام انجام دے چکے ہیں جس کے بعد نئے علماء کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ نئے پیش آمدہ مسائل میں قدماء کے اقوال تلاش کریں۔

یہ مضامین جو مختلف اوقات میں مجلّہ فیوچر اسلام کے لئے املا کرائے گئے تھے دراصل اس خیال سے غذا حاصل کرتے ہیں کہ جب وحیِ ربّانی اپنی تمام تر ابعاد کے ساتھ ہمارے درمیان موجود ہے تو ہمیں یہ کب زیب دیتا ہے کہ ہم اپنے ہی جیسے انسانوں کی فکر سے اپنا چراغ جلائے رکھنے کی کوشش کریں۔ پچھلے بھی ہماری طرح انسان تھے جنھوں نے اپنی عقل وفہم کے مطابق اس چشمۂ صافی سے اکتساب فیض کیا۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے قرآن مجید پر جتنا حق ان کا تھا اتنا ہی ہمارا بھی ہے۔ پھر ہم خدا کی اس نعمتِ عظیم سے راست اکتساب کی کوشش کیوں نہ کریں۔ خدا جو ہم سے کہیں زیادہ ہماری کم مائیگی سے واقف ہے وہ خود یہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے اس کی کتاب میں غور وفکر کا سلسلہ جاری رکھیں: ﴿ افلا یتدبرون القران ... ﴾۔ خدا نے ہم پر یہ ذمہ داری نہیں ڈالی کہ ہم قدماء کے التباسات کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھائے پھریں۔

گذشتہ چودہ سو سالوں میں علوم کی جو ترقی ہوئی ہے اور انسانی معلومات کا دائرہ جس قدر وسیع ہوا ہے اس کے سبب قدماء کے مقابلے میں بعض رموزِ قرآنی ہم پر کہیں بہتر انداز سے منکشف ہوئے ہیں۔ رحمِ مادر کے تخلیقی عمل کو چھوڑیئے جس کی باریک بیں تفصیلات اہلِ فکر کے لئے مسلسل قبولِ اسلام کا سبب بنتی رہی ہے، ابھی تو امکانات کا ایک وسیع سمندر ہے جس سے سِرّیت کے نقاب کا اٹھنا باقی ہے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید میں وقت کے حوالے سے الف سنة اور خمسین الف کے بیانات میں قدماء کو تطبیق دینے میں کافی دشواریوں کا سامنا تھا البتہ اب وقت کے linear اور circular تصورات کو تمام تر ابعاد کا ماحصل نہ سمجھا جانا اس خیال سے عبارت ہے کہ وقت ملٹی ڈائمنشل سے بھی آگے کی چیز ہے جس کا مکمل ادراک لاتسبوا الدھر کی روایتی تفہیم سے نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح چار سے زائد ممکنہ ابعاد کی بحث نے جہاں ایک طرف فضا (space) کے سلسلے میں نئے امکانات کی نشاندہی کی ہے وہیں اس خیال نے فرشتوں، جنوں اور دوسری غیر مرئی مخلوقات کے سلسلے میں بھی ہمارے تصورات کو مہمیز کیا ہے جس کے سبب سورہ نجم کی وہ آیات جو اب تک صوفیاء کی فکری جولانیوں کا مرکز تھیں اب بڑی حد تک خالص سائنسی فکر کا استعارہ بن گئی ہیں۔ کائنات جیسی کہ وہ ہے کم از کم اہلِ ایمان کے لئے معمہ نہیں کہ وہ قرآنی بیانات کے مطابق عدم سے وجود میں لائی گئی اور اب ہر لمحہ نمو کے عمل سے دوچار ہے۔ جہاں قدماء کے تعبیری اشارے کائنات کے سلسلے میں موہوم تصورات سے عبارت تھے وہیں آج ناسا کے کیمرے اور ایسٹروفزکس کے علماء کروڑہا کروڑ کہکشاں کی تصدیق کرتے نظر آتے ہیں۔ گویا فرعون کا یہ سوال کہ ﴿ وما رب العالمین ﴾ اور پھر یہ جوابِ نبوی کہ ﴿رب السموات والارض وما بینھما ﴾ اہل علم پر آج کہیں زیادہ رب کائنات کی ہیبت طاری کرنے کا باعث ہے۔ کل خدا کی کبریائی اور دعوتِ توحید کا انکار جتنا آسان تھا آج اتنا آسان نہیں شرط یہ ہے کہ ہم قرآن مجید کو قدماء کے ذہن سے پڑھنے کے بجائے اسے نئے دماغ سے اور نئی معلومات کی روشنی میں پڑھ سکیں۔

نیا مسلم دماغ قدیم کتابوں کے ورد سے تیار نہیں ہوسکتا۔ خدا کی کتاب کے علاوہ کسی اور کتاب کو مستقبل کی کلید کے طور پر پڑھنا اپنے آپ پر ظلم کرنا ہے اور اس کتاب کے مصنف پر بھی۔ ہمیں دیر یا سویر اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ قدماء کی طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں بھی ایک عدد دماغ سے نوازا ہے جس کا بنیادی فریضہ غور و فکر اور تدبر و تفکر ہے اور جس سے محض ٹوپی رکھنے کا کام لینا یا طربوش برداری کے لئے اسے استعمال کرنا کفرانِ نعمت، بلکہ بغاوت ہے۔ جب تک ہم پھر سے دل و دماغ کو حرکت میں نہیں لاتے اور وحیٔ ربّانی کی تجلیوں سے اپنی راہوں کو منور کرنے کا حوصلہ پیدا نہیں کرتے قدماء کے التباسات ہمارا پیچھا کرتے رہیں

گے اور ہم خود کو ایک ایسی صورتِ حال میں گھرا پائیں گے جسے قرآن ﴿اتخذوا احبارهم ورهبانهم اربابا من دون الله﴾ سے تعبیر کرتا ہے۔

خدا کرے اس کتاب کی اشاعت سے نئے مسلم دل و دماغ کی تعمیر کا کام آسان ہو کہ ﴿يوم لا ينفع مال ولا بنون الا من اتى الله بقلب سليم﴾۔

راشد شاز

یکم جون ۲۰۰۸ء، نئی دہلی